ہمچو اد ھم بحر حق با یک پیالہ جستہ اَم　　مثل قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ بابا عبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۵

ڈگر پنگھٹ کی

روح کا وہ شعور ازلی۔ وہ آدمؑ کی مٹی کا گوندھا جانا تمام انسانی جسموں کی وہ بنیاد اولین۔ پھر روح کا اس جسم میں پھونکا جانا۔ امر ربی کا اجراء اس جسدِ انسانی سے۔ آدم کے سُلب میں ہر ذی وجود کا مرکز وہ مخرجِ اولیں۔ کروڑوں سال کے ارتقائے جسمانی کا شعور روح کی وہ منازلِ ارتقاء۔ پھر سلسلہ در سلسلہ وہ انبیائے سابقہ کی زندگیوں میں ارتقائے روحانی کی منازل کی کڑیاں اور بالآخر نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارک میں اس ارتقاء کی تکمیل۔ ایک ہی سلسلہ وار ارتقائی داستان کی منازل ہی تو تھیں جن کا روحانی شعور ہر شعورِ ازلی رکھنے والی روح کو اس زندگی میں بھی میسر آنا تھا۔ حیاتِ انسانی کے ارتقاء کے مطابق وہ انبیاء کا ورد، صحائفِ آسمانی کا نزول جس کی تکمیل اور تصدیق، قرآن کریم کے ذریعہ ہوئی۔ قرآن وہ آخری پیغامِ احسان، انسانیت پر۔ اسلام وہ دین فطرت، عین فطرت انسانی کے مطابق۔ ہدایت متقی لوگوں کے لئے۔ ایک شرعِ زندگی، ایک طریقت بندگی۔ پھر وہ نبیوں کی داستانیں۔ مرکز خطاب، تمام عالمِ انسانیت اور تکمیل پیام کا وجودی پیکر، تمام عالم انسانیت وہ بزرگوں کی صحبتیں۔ فقراء کی محفلیں، مذہبی مجالس، بزرگانِ دین کے قصے۔ انبیائے کرام کی داستانیں بچپن کی زندگی میں بھی ایک ذی شعور ہستی کے لئے وہ جاذبیت کیسے نہ رکھتیں کہ جیسے یہ سب داستانیں اُسی سے کہی جا رہی ہیں۔ اُسی کی داستان بیان ہو رہی ہے۔ اُسی کو یہ نورِ ہدایت عطا ہو رہا ہے۔ جزو کو کل کا شعور دے کر۔ قطرہ کو سمندر کا شعور دے کر طرح طرح سے یہ بتایا جا رہا تھا کہ حملہ موجودات حق کی تصویر ہے۔ ہمیشہ یہ تصویر رہی اور ہمیشہ رہے گی۔ نہ کبھی نامکمل تھی نہ ہے۔ ایک نمودِ کن جاری ہے۔ مقصد آفرینش اسی سے معمور ہے۔ اس کُن کے شعور کو ارتقاء کہہ لیں۔ اس کائنات کو کھلی کتاب کہہ لیں۔ اس جسم انسانی کو اُم الکتاب کہہ لیں۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے۔ پڑھ کر تفکر کر لیا، لطف تو آیا۔ مگر اپنے جسم کی تجربہ گاہ میں عمل کر کے بھی تو دیکھ لیں کہ اُن داستانوں کا اپنے سے تعلق بھی تو قائم ہو۔ پڑھنا کیا، ہو کر دیکھیں۔ تھوڑا بہت عمل کر کے دیکھیں کہ آخر یہ خیالی باتوں یا صرف عقلی تعلیم تک کی بات نہ رہ جائے۔ حکمت کی باتیں کیا صرف کتابوں یا دماغوں میں محفوظ ہوں یا صرف عقل کے طاق اور ذہن کی الماری میں دھری رہیں۔ یا اس کی جگہ اپنی عملی زندگی میں وہ ذاتی تجربے کئے جائیں کہ روزمرہ زندگی میں ان کی عمل پیرائی ہونے لگے اور قلب پر نازل ہوں۔

چنانچہ قبلہ درانی صاحب نے بچپن اور لڑکپن میں عملی طور پر مختلف طور سے اپنی زندگی پر تجربہ کر کے دیکھا کہ غریبی، افلاس، ناداری، بھوک، بیماری، بدنامی، ٹھکرایا جانا، ظلم کی سختیاں جھیلنا، تنہائی کی اذیت برداشت کرنا وغیرہ کیا ہوتا ہے جب تک خود پر سے یہ حالتیں نہ گزریں دوسروں کا دردِ دل کیسے اپنایا جا سکتا ہے۔ یہ دور بڑا طویل تھا اور بڑا صبر آزما بھی رشتہ دار، عزیز، ہم جماعت ساتھی، ہاسٹل کے ساتھی، بڑے بھائی سب کے سب یہ حالتیں دیکھ کر غم و افسوس کرتے۔ ذہن کی خرابی گردانتے۔ فقراء کی صحبتوں میں رہ کر بہک جانا تصور کرتے۔ نہ اس حالت سے قبلہ کو روک سکتے تھے۔ نہ اس حالت میں ان کا درد بٹا سکتے تھے۔ اپنی طرف سے بہت کچھ دلجوئی کرنے کی کوشش کرتے لیکن اس حالت سے قبلہ کو نکال لینے کا راستہ بھی نہ پاتے۔

داستانیں اس زمانے کی سینکڑوں ہیں جو نہ قبلہ سے دریافت کرنے کی ہمت ہے نہ سپرد قلم کرنے کی اس جگہ گنجائش ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ ہر قسم کی ابتلاء میں سے خود گزر کر دیکھنے کا شوق ایسا سمایا تھا کہ اس آگ کو ٹھنڈا ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ دکھی انسانیت کا درد جس کے عذاب سے بچنے کے لئے کم ہمت لوگ پہاڑوں، تنہائیوں، جنگلوں میں جا بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ اسلام تو مصائب کا مقابلہ کرنے اور ان پر فتح حاصل کرنے کا سبق دیتا ہے۔ ہمدردی انسانیت کا سبق دیتا ہے۔ تو اس راہ پر چلنے سے منہ موڑ لینا کیا بات ہوئی۔

چنانچہ کئی کئی دن بھوکے رہ کر دیکھا۔ پیاس کی شدتیں بھی آزمائیں۔ موسموں کی سختیاں، دھوپ، برسات، جاڑا، گزار کر اس جسم کو ایک تربیت دی۔

غریبوں کے دُکھ درد کو، مالی امداد حسب مقدرت دے کر کم کرنے کی کوشش کی بھوکوں کو کھانا کھلانا سب سے مرغوب مشغلہ گردانا۔ دنیا کے ٹھکرائے ہوئوں کو اپنے کلیجہ سے لگا کر تسلی دینا۔ دوسروں کے کام آنا اپنی زندگی کا مقصد گردانا۔ قبلہ کے ایک علی گڑھ کے روم میٹ اللہ بخش کمالی صاحب حال ہی میں ایک صاحب کو ملے تو قبلہ کی بابت کہا کہ غریبوں کی دیکھ بھال کا جذبہ قبلہ میں طالب علمی کے زمانے میں بھی تھا۔ میں سینئر ہونے کی وجہ سے انہیں حساب پڑھاتا تھا۔ ایک دن وہ ایسے کمرے سے غائب ہوئے کہ رات کو بھی نہ آئے۔ دوسرے دن بڑے اصرار پر بتایا کہ ان سردی کی راتوں میں صرف کرتے پجامے میں یوں نکل گیا تھا کہ دیکھوں یہ جو علی گڑھ کے کٹ پُلے کے نیچے غریب غُربا کھلے میں یا معمولی سائبانوں میں یہ سردیاں گزارتے ہیں ان کی کیا حالت ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے کو صرف اخبار سے ڈھانکے رکھا اور کھلی جگہ میں رات گزار دی۔ اس کے بعد اب مجھے معلوم ہوا کہ سردی کی اذیت کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ چوبیس گھنٹہ میں ان غریبوں کو ایک منٹ بھی آرام نہیں ملتا۔

اسی طرح ایک اور ساتھی نے بتایا کہ درانی صاحب کے ساتھ دوستوں نے دو ایک بار ایسا بھی کہا کہ رات کو جب وہ ہم لوگوں سے مل کر واپس جاتے تو ان کی سائیکل سے ہوا نکال دیتے اور وہ بغیر کسی سے کچھ کہے خاموشی سے اپنی سائیکل ہاتھ کے سہارے چلاتے چل دیتے۔ دوسرے روز بھی کچھ نہ کہتے۔ تو انہیں خود اس حرکت سے شرم آئی۔

اسی لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں جہاں قبلہ نے بزرگانِ دین یا مشاہیر عالم کی زندگیوں کے کچھ واقعات سے تاثر لیا وہاں ان پر عملی پیرایہ میں کبھی کبھی اپنی ذات پر تجربہ کر کے بھی دیکھا۔ پیغمبروں کے حالات پڑھے یا سنے تو ان سے نسبت قائم کرنے کے لئے اپنی سوچ کے مطابق کچھ کر کے بھی دیکھنا چاہا جیسے کہ آخر وہ جو حضرت یحییٰ نے خویش و اقارب سے قطع تعلق کیا۔ کیا بات تھی۔ جب یہ کر کے دیکھا تو کرتے کرتے سارا عالم ہی اپنا خاندان ہو گیا۔ الخلق عیال اللہ کی تصویر۔ کس چیز کو اپنا کہیں۔ سب کچھ ہی سب کی خلقت کا دُکھ درد اپنا دکھ درد بن گیا۔ ان کی دلجوئی، اپنا شیوہ ہو گیا۔ اپنی زندگی سب ہی کی زندگی ہو گئی۔ ایک ہی رشتہ میں سب منسلک ہو گئے۔

صبر ایوبی کو دیکھنا چاہا تو وہ زخم، ناسور، بیماری میں، غیر آباد جگہوں، گھورے پر لیٹ کر دیکھا۔ وہ صبر کی لذت، کیسی شکایت کیسا شکوہ۔ پوری زندگی صبر کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی۔ باطن کے چراغ اُن زخموں کے ساتھ روشن ہو گئے۔ وہ روح کی ازلی تنہائیاں کیسی۔ خدا اور بندہ ساتھ ہی تو تھے۔ باہر والے اس کیفیت کو کیسے پاتے کہ جب بھی کسی کو بیماری کی کرب و اذیت میں دیکھا تو اس کا غم کچھ ایسا اپنایا کہ اپنے پر بھی وہی حالت طاری ہو جاتی۔ بیمار کے ساتھ ساتھ خود بھی کم از کم ذہنی طور پر اس تکلیف میں سے گزر رہے ہوتے۔ اور پھر جب شوق بڑھا تو فقراء کی صحبتوں میں بیٹھ بیٹھ کر یہ عمل

بھی سیکھ لیا کہ کسی بیمار کی بیماری کس طرح اپنائی جاتی ہے اور کس طرح اسے اپنے جسم میں جذب کر کے، بیماری کو اپنے اوپر لے کر، اس مریض کی شفاء کا سبب بنا جا سکتا ہے اب معلوم ہوا کہ انبیاء کا اپنی ذات پر سختیاں جھیلنا اسی لئے تو ہوتا تھا کہ عالم انسانی کے اعمال کی کچھ اس طرح مکافات ہو جائے یہ عالی ظرفی، عالی ہمتی کی باتیں، تخیل میں بھی خود کر کے دیکھی جائیں تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تو عشاق کی باتیں ہیں کہ یار کے قہر کا بھی وہ اپنے ہی کو حقدار سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ جانتے ہیں کہ سرمد نے کس جذبہ کے تحت کہا تھا۔

یا تن بہ رضائے دوست می باید داو

یا قطع نظر زیار می باید کرد

قصہ مختصر صبر ایوبی کا رنگ کچھ قبلہ پر ایسا چھایا کہ اسی منزل میں بڑے بڑے عشق کے دعویدار فقراء سے میدان جیت لینے کی راہ دیکھی۔ اور جسم کا یہ حال ہوا کہ ایک بیماریوں کا جنجال کوئی ٹی۔بی، ایسی نہ تھی جو قبلہ کو نہ ہوئی ہو۔ گلانڈز کی ٹی بی، پھیپھڑوں کی ٹی بی، آنتوں کی ٹی بی ہڈیوں کی ٹی بی۔ آج بھی جسم کو دیکھیں تو گردن کے ارد گرد گلانڈز کے آپریشن کے نشان۔ دائیں شانے کی ہڈی گل گل کر بہت زمانے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب صرف رگوں ریشوں پٹھوں سے دایاں ہاتھ لٹکائے پھرتے ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی کے تین مُہرے پہلے ہی گل چکے تھے۔ ان پر مہینوں پلاسٹر جسم کے پنجر کے گرد بندھا رہا پھر جب یہ کاٹا گیا تو اس کے بعد برسوں، سخت چمڑے کی ایک قبضہ دار کاٹھی، اس جسم کو سہارا دینے کے لئے پہنی جاتی رہی۔ اور اوپر سے قمیض۔ سینے کے دائیں جانب نیچے کی دو پسلیاں ایک رِستے ہوئے ناسور سے تمام جوانی میں متاثر رہیں۔ اب تین چار سال سے وہ پوری ہڈیاں گل کر، سینہ کی وہ ہڈی بھی گل چکی ہے جو درمیان میں ان ہڈیوں اور سینے کے پنجر کو جوڑے رکھتی ہیں۔ اب سینہ کی ہڈیوں کے لٹکے ہوئے پنجر کو جوڑے رکھنے کے لئے ان سینہ کی ہڈیوں کو ایک خود ساختہ فریم اور کاٹھی کے ذریعہ پیڈ و بیلٹ وغیرہ اور تسموں کے ذریعہ باندھ رکھا ہے اور اوپر سے قمیض زیب تن کر لی جاتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ تقریباً بیس سال سے ی جسم کا پنجر اسی طرح بندھا ہوا زندگی گزاری جا رہی ہے۔ دنیا کے کام بھی کئے جا رہے ہیں۔ اسی حالت میں پرنسپلی کے بھی کئی برس گزارے۔ محفلوں میں بھی شرکت کی۔ ورکشاپ کے کام بھی ہوئے۔ اپنے ہاتھوں سے اوزاروں کے استعمال بھی ہوتے رہے۔ روزانہ گھوما پھرا جاتا بھی رہا۔ بیماروں کی واداروبھی کی گئی۔

بدن کے اور حصے دیکھیں تو دائیں ہاتھ کی انگلیاں ایک ایکسیڈنٹ میں ٹوٹیں۔ ڈاکٹر نے غلط جوڑ دیں وہ اسی طرح برسوں سے ہیں۔ ایچ ء میں ہاتھوں سے کام کرتے وقت کرسی پر گر جانے سے بائیں بازو کی اوپر کی ہڈی میں ڈبل فریکچر ہوا۔ یہی کیا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر قسم کی بیماری اس جسم پر سے گزری ہے اور بیماریاں ہی کیا، کئی بار موت سے بھی اپنی زندگی میں دوچار ہو چکے ہیں۔ سانس ختم، قلب کی حرکت بند، کلکتہ میں امریکن ڈاکٹر نے دیکھا تین چار منٹ بالکل جسم مردہ۔ جب جان واپس آگئی تو وہ خود حیران۔ پشاور کی زندگی میں کم از کم پانچ بار اعزا اقربا نے دیکھا کہ چکر سا آیا، گر پڑے۔ سانس، نبض، دل کی حرکت بند۔ پھر دو ڈھائی منٹ بعد سانس واپس۔ تو سوائے عاجزی کے اور عقل اس کا کیا حل پیش کرے۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی اور ہی قوت زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے اب اس جسم کے پنجرے میں روح مقید نہیں بلکہ سوار ہے اسی کے حکم پر یہ جسم کا ٹوٹا پھوٹا گھوڑا چل رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہ جسم کا پنجر اپنے وقت کی منازل طے کر رہا ہے۔ جسم و جان کو بند کی قید سے کبھی کی آزادی مل چکی ہے اور لطف یہ کہ برسوں سے جو لوگ قریب سے دیکھ رہے ہیں ساتھ ہی لگے ہیں۔ ان تک نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ سخت سے سخت تکلیف میں بھی چہرے پر مسکراہٹ یا آنکھیں

اسی طرح روشن اور چمکدار نہ ہوں جو ایک صحت مند انسان کی ہوتی ہیں۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ نہ ہو۔ جس کو دیکھ کر غمزدہ سے غمزدہ انسان اپنے غم کا مداوا پالیتا ہے۔ کبھی جو، ایسی کیفیات، تڑپا دینے والی کیفیات کے بعد، کوئی ساتھی دریافت کرتا ہے کہ قبلہ یہ جو ادھر رونا دھونا مچ گیا تھا اور آپ بالکل ختم تھے تو اس وقت آپ کی کیا حالت تھی تو مسکرا کر شعر پڑھ دیتے ہیں۔

تمہیں کیا بتائوں میں ہمنشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا

نہ ملا مسیح و خضر کو بھی حیاتِ عمر دراز میں

یہ شعر قبلہ نے طالب علمی کے زمانہ میں پڑھا تھا اور کچھ ان کی زندگی میں ایسا چپکا کہ اس کی تہ تک خود ہی پہنچ کر دیکھا۔

صبر ایوبی کی اس داستان سے کہیں شدید وہ ذہنی اور قلبی اذیتیں ہیں جن سے قبلہ کو اپنی زندگی میں دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کی تفصیل بجائے خود ایک داستان ہے۔ وہی بات کہ سمندر کا کون سا کنارہ، کون سی گہرائی، تب ہی تو بابا جان نے دیکھ کر کہا تھا۔ صبر ی ندی۔ اوہ کتنی گہری، قبلہ کی زندگی میں۔ لعن طعن، بدنامی، حق تلفی، تہمت، بہتان، دُشنام راستے میں رکاوٹوں کے طومار۔ کیا کیا بیان کیا جائے۔ برس ہا برس کی زندگی ان دل شکن اور صبر آزما واقعات سے بھری پڑی ہے۔ دیکھنے میں یہی آیا کہ قبلہ کے چہرہ پر خراب سے خراب بات کی وجہ سے بھی کبھی شکن نہ آئی۔ لوگوں نے مفت دوا کی تقسیم اور خدمت کو بھی شہرت حاصل کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ تہمتیں اور بُہتان گھڑے۔ مگر قبلہ نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے مسکرا کر سب کچھ برداشت کیا۔ لوگوں سے وہ برتائو رکھا کہ جن پر اپنا اختیار بھی تھا، جن کو گستاخی کی سزا بھی دی جاسکتی تھی ان کے آگے بھی اپنے کو ہی خطاوار گردانا۔ ہر انسان کی عزتِ نفس کو احترامِ آدمیت کے مقام سے ہی نوازا۔ اس مقام کی شریعت کی عملی تفسیر کتنے مردانِ خدا ہوں گے جو اپنی زندگیوں میں کر سکے ہوں گے۔

اس فقیری میں گالیاں بھی کھانی ہیں اور دعائیں بھی دینی ہیں۔ قبلہ کو بھی، فی سبیل اللہ برس ہا برس کی خدمت کا یہی صلہ ملا کہ دو ایک نے نہیں بلکہ کئی ایک اصحاب نے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں میں، بازار کے چوک میں، بسوں میں، وقت بے وقت، وجہ بلاوجہ، قبلہ کی اس خدمت خلق کے خلاف جیسے لگاتار محاذ سا قائم کر لیا۔ بر سرِ عام انہیں بُرا بھلا کہا۔ تہمتیں لگائیں، پھر جب یہی لوگ کسی بیماری یا تکلیف میں گرفتار ہو کر۔ دوسری جگہوں سے ناامید ہو کر قبلہ کے سامنے پہنچے تو قبلہ نے اس دردِ دل سے ان کا علاج کیا یا تشفی دی کہ ان کی زبانیں بھی بند ہو گئیں۔ ایک صاحب اثر نے قبلہ کے مرشد کی سوانح حیات کی پہلی جلد خود ہی چھپوانے کا ذمہ لیا اور چھاپنے والے صاحب نے اُن سے یہ شرط براہ راست طے کی کہ دو تین سو کاپیاں دے کر وہ بقیہ فروخت کر کے اپنے اخراجات کی وصولی کا تقاضہ براہ راست قبلہ سے کیا۔ قبلہ نے اپنی تنخواہ سے رقم بچا بچا کر یہ قرضہ خود ہی قسط وار ادا کیا۔ مگر رقم کی ادائیگی کے دوران میں وہ چھاپہ خانہ والے صاحب۔ اب نہ جب قبلہ کے پاس آجاتے۔ ادائیگی کا تقاضہ کرتے۔ بُرا بھلا کہتے یہاں تک کہ گالیاں تک دینے لگتے اور قبلہ نیچی گردن کئے یہ سب کچھ سُنتے۔ اور منت سماجت کر کے کچھ اور وقفہ مانگ لیتے۔ اس طرح ایک مدت کے بعد ہی کہیں یہ قرضہ ادا ہو سکا۔ مگر واہ رے شانِ فقیری۔ واہ رے صبر ایوبی کہ بجائے قہر درویش کے، مہرِ درویش سے ہی ان چھاپہ خانے والے صاحب کو نوازا۔ ان پر دنیا کا ایسا منہ کُھلا کہ لکھ پتی ہو گئے۔ الحاج بھی کہلائے۔ اس طرح گویا فقیر ایک کا ستر گنا کیا ستر ہزار گنا دے کر بھی اپنے کو مسکین اور عاجزی رکھتا ہے۔ پھر جب کسی نے اس کے مرشد کی سوانح حیات چھاپی ہو تو کیسی بد دعا۔ اُن کے لئے تو الٹی دعا کرتا ہے۔ مگر یہ دنیا کا سودا بس دنیا تک ہی ہے۔ آخرت میں

تو سوائے محبت، وفا، خلوص، عاجزی کے دوسرا سکہ نہیں چلتا۔ امت کے بوجھ، گنہگاروں کے بوجھ، اپنی گٹھڑی میں باندھ کر آخرت کا رختِ سفر تیار کیا جاتا ہے اور اس دنیا سے روانگی کے وقت یہی گٹھڑی اپنے کاندھوں پر اٹھائے، محبوب کی درگاہ میں سُرخرو ہوا جاتا ہے۔

یہ اور اسی قسم کی ہزاروں داستانیں فقیر کی زندگی کا ماحصل ہیں۔ غیروں اور دنیاداروں کا، فقیر کے ساتھ سلوک ہی کیا بیان کرنا۔ وہ تک جو اپنے کہلاتے ہیں۔ جن سے مادی جسمانی رشتہ بھی ہوتا ہے یا جو عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے فقیر کے ارد گرد لگے رہتے ہیں اسے اپنی دنیاوی اور عقبیٰ کی مشکلات کے حل کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ وہ بھی فقیر کے ساتھ تقریباً اسی قسم کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ کچھ نہیں تو شکوہ شکایت، کنارہ کشی، تضیع اوقات کرانے کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ فقیر کو یہ سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔

صبر ایوبی کو جہاں قبلہ نے جسم و ذہن و نفس کی سطح پر اپنایا ہے اور اس صبر کو اپنی جسمانی زندگی کی مشعل راہ بنایا ہے۔ وہاں قلب کی سطح پر نسبت عیسوی کی مشق کی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا وہ پیام، مظلوم انسانیت پر احسان۔ رحم و کرم و عفو و درگزر کی عام خوشخبری، غریبوں سے محبت و ہمدردی، صبر و توکل اور عاجزی کی معصوم تصویر بنے، حق کا پیامِ محبت، خلق تک پہنچانا، شفقت عق الٰہی کے جذبہ میں مخلوقِ الٰہی کی مسیحائی کرنا۔ یہ مسیحائی جہاں ہومیوپیتھک طرزِ علاج کے پردے میں کی جارہی ہے وہاں دردِ دل سے محبت کے انداز میں کسی کا دکھ اپنا کر اُس مجبور پر ہاتھ رکھ دینا اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ صداقت سے کسی بیمار کسی پریشان حال سے قلبی رابطہ قائم کرلینا اس کی شفاء تسلی اور سکون حاصل کرلینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ محبت کے جذبہ کی اس بے پناہ قوت کو اپنا کر لاعلاج مرضوں کا علاج بھی ہوا ہے اور ٹوٹے دکھی دلوں کی دادرسی ہوئی ہے۔ قلب کی سطح، دل کی چاہ ہے اوپر کی سطح ہے جہاں خلوص اور صداقت، دعا کی مقبولیت کی ضامن ہوتی ہے۔ قلب کی سطح دل کی چاہ ہے دل میں یار بسا ہے۔ نظروں میں یار سمایا ہے تو جو چاہا وہ یار ہی نے چاہا۔ اپنی ''میں'' کا یہاں دخل نہیں۔ یار ہی کی جلوہ فرمائی ہے اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ جو کچھ اس شدت میں چاہا وہ پورا نہ ہو۔ بیماروں کی مسیحائی نہ ہو۔ بس ایک دل ہل جانے والی بات ہے۔

عاشق کی دنیا دل کی دنیا ہے۔ خود ایک شمع سوزاں اور اب پر تُو ہی تُو۔ یہ دل کی آگ کچھ ان حقیقی معنوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ ماحول اس کی تائید کرتا ہے۔ قبلہ کا بھی اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جسم سے بُھنے گوشت کی بُو آتی۔ یہی آگے چل کر مُشک یٰسین میں بدل کر حیات روح کی ضمانت بنتی ہے اور ماحول پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ کسی کی عاجزی، کسی کی تکلیف نے دل ہلایا اور مسیحائی ہوئی۔ یہ کچھ لازم و ملزوم سی شے ہے۔ دل کی دنیا، عاجزی کی دنیا ہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں۔ سب کچھ یار کے لئے۔ سب کچھ یار کے نام پر۔ سب کچھ یار کی طرف سے عشق نے اپنا تخیل، اپنا سب کچھ بھسم کر ڈالا ہوتا ہے یار کی کارفرمائی کے علاوہ اور کچھ نہ دل میں سماتا ہے، نہ آنکھوں میں، نہ خیالات میں۔ بغیر عشق میں فنا ہوئے اس مقام کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ یہ محبت کا جذبہ ایک بے لوث سی بات ہے۔ بے خودی کی سی بات ہے کہ یہاں جذامی بھی اتنا ہی حسین لگتا ہے جتنا کوئی خوبرو۔ یہاں عاجز کی آنکھیں، خلوص و محبت کے جذبے کو ایک مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ یہاں ٹوٹے ہوئے دل کے روزن، روئے یار کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

عیسوی نسبت سے اسی اندازِ مسیحائی کی جھلک کا نتیجہ تھا کہ جب قبلہ درانی صاحب بابا قادر اولیاءؒ کے حضور حاضر ہوئے تو ایک دن جوش میں باباجان نے فرمایا ''تیرے ہاتھ میں ہے فنابقا، ملائک، دنیاہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ اسی مسیحائی کا طفیل ہے کہ آج پشاور میں قبلہ درانی صاحب ایک ماہر معالج شمار کئے جاتے ہیں۔ تمام علاجوں سے ناامید ہونے کے بعد اب تک سینکڑوں اشخاص مہلک بیماریوں سے شفایابی حاصل کر چکے ہیں۔

اس سے قبل ایک وہ بھی زمانہ تھا جب موسوی اندازِ پابند شریعت ہونے کا رنگ چڑھا تو نہ نماز قضانہ تہجد، راتوں عبادت، تسبیح، اذکار میں گزر ہوتی۔ ممنوعات سے پرہیز برتا جاتا وہ عصائے موسوی، وہ جادوگروں، پڑھنے والوں کے سامنے توکل برخدا، صف آراہو جانا، خود بھی کر کے دیکھا۔ خود بھی فرماتے ہیں کسی کا ہاتھ کمر پر ہو تو نہ شکست کھا سکتا ہے، نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ تاریکیاں خود ہی چھٹنے لگتی ہیں۔ وہ یدِ بیضیٰ، وہ علم لُدنی اور خضرِ راہ، وہ عقل کو عاجز کر دینے والی، مرضیٔ الٰہی، مشیتِ ایزدی کے مطابق عمل پیرائی ہر ایک کے لئے مقرر ہے۔ دیکھنے والی آنکھ یدِ بیضا کا اعجاز دیکھے کہ جس کام میں ہاتھ ڈال دیا کامیابی سے نوازے گئے۔ ایک شدتِ انہماک کار۔ ایک خود اعتمادی، خدا اعتمادی میں ثابت قدم ہو کر عمل پیرا ہو جانا، موسوی نسبت کی بات ہے۔ اپنی عقل، اپنے ہاتھ سے جو کام کیا اور شدتِ انہماک سے کیا اس میں اُس نورِ عقل کی ہدایت بھی پائی جو قوی ارادہ رکھنے والے جلیل القدر لوگوں کے مقدر میں ہوتی ہے۔

پھر وہ نسبتِ یوسفی۔ احسن القصص اپنی زندگی کی وارداتوں میں بھی تو دیکھنا تھی جب تک ان واقعات سے نہ گزرا جائے۔ پاکدامنیٔ یوسف کی عظیم مثال کی تصدیق اور اس کی عظمت کیسے روح و جان میں اترے۔ چنانچہ قبلہ نے بھی اپنی زندگی میں دو چار بار ایسے واقعات اپنے اوپر سے گزارے جہاں اچھے اچھوں کے پائوں ڈگمگا جاتے ہیں۔ پانی میں رہ کر دامن تر نہ ہو، کہہ دینا آسان ہے کرنا مشکل، عشق ازلی، جسم و جان میں پیوست ہو، جوانی کا عالم اپنی اٹھان پر ہو تو یہ عشق، مادی جسم کے لگائو تک کی بات رہ جاتی ہے۔ گو یہ تڑپ حقیقت میں روح کی اپنے اصل سے ملنے کی تڑپ ہے۔ اسی عالم میں انسان کے ظرف کا پتہ چلتا ہے کم مایہ انسان جسمانی زندگی کے دریا میں غرق ہو کر اپنی راہ کھوٹی کر ڈالتا ہے۔ اور مردِ میدان، نسبت یوسفی کے سہارے نہ صرف ماہِ کنعان بنتا ہے بلکہ عالم انسانیت کے لئے بھی اس کے خوابوں کی تعبیر بن جاتا ہے۔ جب تک جانِ من، جانِ عالم نہ ہو، جب تک یوسف بے کارواں بنا کاروبارِ جہان کے زندان میں گرفتار نہ ہو انسانیت کے مقدر کے خوابوں کی تعبیر کیونکر دے۔

پھر ان کا ذکر جو محبوب رب العالمین ہوں۔ انبیاء کے سرتاج، افضل البشر، ختم المرسلین، رحمتِ عالم، خلق عظیم اخلاق کا مجسمہ، محبت کے پیکر، شفیع المذنبین، وسیلۂ دو جہان، عاجزی، مسکینی، توکل کی زندہ تصویر۔ وہ کالی کملی، غار حرا، معراج، امتی امتی بالمومنین رئوف الرحیم۔ وہ انسانیت کو امن، آشتی، سلامتی، اخوت، صلہ رحمی کا سبق دینے والے۔ وہ جن کے لئے قبلہ اکثر حالی کا شعر پڑھتے ہیں اور جو آج بھی ان کی زندگی کا سرمایہ ہے۔

وہ بجلی کا کڑکا یا تھی صوتِ ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

لہٰذا ذاتِ مبارک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ جو قبلہ کے حساس دل پر جما اس نے ایسے نقش حیات ابھار دیئے جو اپنی بھی زندگی کا سرمایہ بن کر رہ گئے۔ حضور اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کو صرف تکریم، تخیل یا آئیڈیل کے پہلو تک تو بہت سوں نے اپنایا مگر اپنی نجی زندگی میں وہ پوری کی

پوری قابل عمل تصویر بھی تو جمانا تھی جو اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کے لئے قرار دی گئی تھی۔ اسلام میں داخل ہونے کے لئے وہ جمعیت بندی، صلح پسندی، رحمدلی، انسانی ہمدردی، مساوات، خدمت، ایثار، قربانی، توکل، عجز، انکسار، صبر، شکر، دیانت، امانت، سخاوت، شجاعت اور تمام اعلیٰ اقدار پر کار فرمارہ کر روز مرہ زندگی گزارنا تھی۔ قبلہ نے بہت سے مصلحین اور قائدین کی سوانح حیات پڑھی تھی مگر اس افضل نمونے کی تابناکی کے آگے تو سارے کے سارے جھوٹے نگینے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ وہ صحابہ کرام کی مثالی جماعت، انسانی تاریخ کی وہ گراں بہا داستانیں تو تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں۔ یہ درخشاں گروہ مومنین تو فروغِ عالم انسانی کے لئے ایک کھلی کتاب کے طور پر پیش ہوا تھا۔ اب کہیں انسان صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ کہلانے کا مصداق بنا۔ دین دنیا کو توازن میں لئے ربوبیت کا مظہر ہو کر پیش ہوا۔ اب کہیں کاروانِ انسانیت کو اپنی راہ ملی۔ پگھٹ کی ڈگر ملی۔

پگھٹ تک تو پہنچنا اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ یہ ڈگر بھی بہت کٹھن ہے اس راہ میں کانٹے بھی ہیں۔ طعن و تشنیع بھی ہے۔ وطن بھی چھوڑنا ہے پیٹ پر پتھر بھی باندھنا ہیں۔ تنگی و عشرت میں زندگی بھی بسر کرنا ہے۔ فاقہ پر فاقہ۔ بستر فرش۔ ایک ٹاٹ کا بوریا پتھر، سنگ باری، جگ ہنسائی، ظلم، بیداد، شعب ابی طالب۔ یہ ایسی ایسی ساری حیات طیبہ کی سینکڑوں مثالیں اس پگھٹ کی راہ کی نشانیاں ہیں۔ پن گھٹ کی راہ کربلا کا میدان ہے۔ اپنی اور اپنوں کی قربانی پیش کرتی ہے۔ کیسا شکوہ کیسی بد دعا۔ ان میں سے اسی رحمت للعالمین کردار کی بلند مقامی دکھا کر گزر جانا ہے۔ یہاں تو اپنے رفقاء اپنے عزیزوں لخت جگر نورِ نظر کی شہادت کے بھی امام حسینؓ اور امام زین العابدینؒ والا کردار ادا کرنا ہے امت کی عاقبت خراب ہو جانے کے خیال سے آخری دم تک معافی کی پیشکش، اتمام حجت، نبیؐ کریمؐ کی جانب رجوع کرانے کی کوشش اور تمام واقعہ کے بعد بھی نعت رسول مقبولؐ، کیسی خدا سے شکایت، یہاں تو خلقت کو خالق کی نظر سے دیکھنا ہے۔ ظالم کے ساتھ بھی وہی احترامِ آدمیت کی سنت برتنا ہے۔ وہ سمندر کا سا ٹھہرائو کہ لاکھ پتھر پھینکیں۔ ڈنڈے ماریں مگر سینہ پر ضرب کاری کے بعد پھر اسی فطری سکون پر آجاتا ہے۔

قبلہ کے لئے یہ اسوۂ حسنہ زندگی کی کائنات بن گیا۔ روز مرہ زندگی میں اسلام کا وہ سبق حقیقت بنی۔ فطرت سے ہم آہنگی، ربط ملت، خدمت خلق، فروغِ ملت ایک لائحہ عمل کے طور پر پیش ہوا۔ اور اسلام کے نصب العین کے فروغ نے ایک تازیانہ کا کام دیا۔ اب قبلہ کو معلوم ہوا کہ کیا دنیا کیا دین مسلمان کی زندگی تو کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جیسے چراغ کہ جہاں روشنی گئی تاریکی خود بخود دور ہوئی۔ نور محمدیؐ کے انوار کی بارش میں کلمہ کیا پڑھا، کلمہ ہو جانے کی بات نظر آئی۔ مجنوں بھی لیلیٰ کا کلمہ پڑھتا تھا۔ وجود میں لیلیٰ ہی بس گئی۔ یہاں تو دائم اقدار والی لیلیٰ کو اپنانا تھا۔ پھر فنا کہاں، زندگی کے سرچشمے سے رابطہ کی بات تھی۔ سب سے بڑی سنت امت کا درد۔ معراج تک میں اپنی فکر نہیں بلکہ امتی امتی۔ اس لئے یہی سنت قبلہ کی زندگی کا ماحصل بن گئی۔ سب کچھ امت کے لئے۔ پھر جب بزرگانِ دین کے فیضان سے باطن کی راہ کھلی تو معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کے پیغام کا احسان تو عالم امر عالمِ محبوبیت سے تعلق رکھتا ہے۔ رحمت محمدیؐ **وسِعَ کُلَّ** شیئٍ ہے۔ اسی شمس حقیقت کے انوار کی تابانی کی عکاسی ہر مومن کو اِس کائنات میں کرنی ہے۔ روح امر ربی ہے اور رحمتوں کے انوار میں، مقامِ روح پر نسبت محمدیؐ کے طفیل مومن کی عمل پیرائی ہے۔ اسی کے طفیل قبلہ کی زندگی میں جہاں ہر روز ایک نئی قلندرانہ آن بان ہے کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شان ہے۔ وہاں یہ بھی بین طور پر نظر آتا ہے کہ جسم کی سطح پر نسبت ایوبی کو اپنایا ہے۔

قلب کی سطح پر نسبت عیسوی کو اور روح کی سطح پر نسبت محمدؐی کو۔ اس کے علاوہ تصوف کی وہ آٹھوں خصلتیں جو آٹھ پیغمبروں پر مبنی ہیں اپنی تابانی علیحدہ دکھا رہی ہیں یعنی سخا ابراہیمؑ، رضا اسمٰعیلؑ، صبر ایوبؑ، خاموشی ذکریاؑ، کنبہ بھی غیر کسی سے توقع نہ رکھنا، یحییٰؑ کا عام لباس موسیٰؑ کی قلندرانہ زندگی عیسیٰؑ کی فقر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان منازل سے بے راہرو کا گزر جانا ناممکن العمل سی بات ہوتی ہے۔ یوں دوربین لگا کر منزل کو دور سے دیکھ لینا ارتقائے انبیاء بھی توطے کرنا ہوتی ہیں جن کے طے کرنے کے لئے عالم انسانیت کو لاکھوں سال لگے۔ یہ حضور بابا قادر اولیاء کا فیضان تھا کہ جب قبلہ درانی صاحب ایک شکستہ جسم لے کر دیدار کی غرض سے پہنچے تو بابا جان نے نہ صرف جسم کو حیاتِ نو عطا فرمائی۔ بلکہ حیاتِ روح کی منازل بھی مقامِ آدم علیہ السلام سے لے کر مقامِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اپنی شفقت کے سایوں میں طے کرادیں۔ روحانی ارتقاء کی یہ کہانی خود قبلہ نے اپنی کتاب وردای سادھو میں بیان فرمائی ہے۔ یہ کیف کُن کی واردات ہے اور اسی کیف میں کچھ اس حقیقت کی فہم ہو سکتی ہے۔ دیکھا جائے تو ساری دنیاوی تگ و دو اور کوشش، ساری کامیابیوں کا راز، اپنے باطن کے خزینوں کا کھلنا ہے۔ من عرف نفسہ، فقد عرف ربہ، جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو پہچانا۔ اگر صرف جسمانی، دماغی، اخلاقی اور ظاہر کی سطح کو ہی منزل گردانا، تب بھی اس کی حدیں لامحدود اور اگر اپنی حقیقی، اپنے باطن کی جانب رجوع ہوا۔ تب ہی کہیں حقیقت شناسی کی راہ کھلی۔ کیونکہ ظاہر تو صرف عکس اور ظل ہے حقیقت کا اپنا باطن ہی حق کا آئینہ ہے۔ حق یا حقیقت وہی ہے جس پر اعتماد کُلی ہو۔ ایمان ہو، بھروسہ ہو، اس تک پہنچ، ایقان کی سطح ہے جو ایمان سے بھی گہری بات ہے۔ کسی چیز پر ایمان رکھنے میں یا اس کو جاننے میں بھی ایک قسم کی دوری اور دوئی رہ جاتی ہے مگر ایقان خود ان تجربات سے گزر جانے میں حاصل ہوتا ہے۔ ایمان اگر محبوب کی محبت کا نام ہے تو ایقان، محبوب سے ایکائی حاصل ہو جانے کی بات ہے۔ ایسی توحید کہ اپنے میں اور محبوب میں کوئی دوئی نہ رہ جائے۔ یہ توحید کا مقام، صدیق کے نصیب کی بات ہے، کیونکہ اس کی صداقت کی سطح، قلب روح سے بھی پرے منبع وجود میں ہوتی ہے یہ کیفیت بغیر عشق کی صداقت اور شدت کے حاصل نہیں ہوتی۔ ایک طالب ہی اپنے جسم، ذہن، نسل، علم، شہرت، اقتدار، دولت، عیش و آرام وغیرہ سب بندشوں سے نکل کر ان سخت زنجیروں کو توڑ سکتا ہے۔ طلب حقیقت یا طلب محبوب میں یہ روکاوٹیں اس کی راہ کھوٹی نہیں کرتیں۔ یوں وہ اپنی لاکر لیتا ہے۔ ان سطحی لذتوں سے بچ کر وہ انتشارِ شخصیت سے بچ جاتا ہے۔ اپنی ''میں'' کے ان سینکڑوں بتوں کو توڑ کر وہ شرک سے بچ جاتا ہے۔ اور ایک ہی محبوب کے قدموں میں اپنے کو لاڈالتا ہے۔ آرزوئیں، تمنائیں، لذاتِ جسمانی، غصہ، خواہش، غرور اس کی صداقت طلب میں حاصل نہیں ہوتے۔ وہ اس طرح جیتے جی دنیا سے مر چکا ہوتا ہے اور محبوب میں اسے نئی حیات عطا ہوتی ہے۔ یہ ایمان کی روشنی ہے، بقائے جاوید ہے جسم کی اس موت کے بعد، اسی دنیاوی زندگی میں اسے بقا کی منزل مل جاتی ہے۔ یہ روح کی حیات ہے، روح کی جڑوں تک کی بات ہے۔ بصیرتِ روح کی بات ہے، بصیرتِ روح کے بعد ہی اپنی محبت اور ایمان کی سطح بلند ہو کر ایقان کی سطح بن جاتی ہے۔ خود اپنے وجود کے اندر اسے حسن لم یزل کی تجلی ملتی ہے تو کیف انبساط میں وہ خود پھٹ پڑتا ہے انا لیلیٰ انا الحق کہہ اٹھتا ہے۔ یہ مقامِ جبروت ہے۔ شیخ کے احسان سے، نسبت محمدی عطا ہونے کے بعد وہ قہاریت حُسن بے مثال کا خود آئینہ دار بنتا ہے۔ یہ خشیت حُسن، یہ جباریت بس ہمکنار ہونے کی سی بات ہے اور جب وہ رحمت کو اپنے لئے، اپنے سے کہیں زیادہ بیتاب پاتا ہے تو ایک مجنونانہ جذب کی حالت اس پر طاری ہوتی ہے۔ بغیر جذب کے ان لذتوں سے شناسائی یوں بھی ناممکن ہے۔ وِدرای سادھو کتاب میں اسی رُوح کے انبساطِ کُن کی جھلکیاں کچھ ان گہرائیوں سے پیش کی گئی ہیں کہ ایک طالب حقیقت پر گہرا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور کچھ اس صداقت میں کہ جیسے کہ یہ منازل ارتقائے باطن خود اس پر سے گزر رہی ہیں۔

جن خوش قسمتوں کے مقتدر میں اس دنیاوی زندگی میں ہی روح کا شعور حاصل ہو جانا مقرر ہے۔ ان کو بصیرتِ روح حاصل ہو جانے کے بعد ہی شیخ کے کرم اور احسان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تب ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں اپنے ارتقائے جسمانی کی تمام منازل طے کرتا ہے۔ اسی طرح شفقت شیخ میں یہ ارتقائے روحانی ممکن ہے۔ پھر ایک دفعہ یہ پیدائش روحانی یا پیدائش باطن ہو جانے کے بعد روح کی جوانی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ محبوب کے ساتھ، وہ وصال کی لذت، وہ کیفِ انبساط کہ دل چاہے کہ اس کی خوشبو سات طبق نیچے اور چودہ طبق اوپر صدیقوں کی جماعت میں پھیل جائے اسی خوشبو کو لئے وہ قریہ قریہ کوچہ کوچہ صدیقوں کی تلاش میں پھرتا ہے۔ یہ تنہا سفر، یہ خدمتِ خلق کا جذبہ، یہ حقیقت حق کو نشر کرنے کی بیتابی۔ مگر یہاں تک پہنچنے کے لئے گویا خون کے دریا میں قدم رکھنا ہے۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر منزلِ مقصود کی طرف چل پڑنا ہے۔ اس راہ میں جنگل بھی ہیں، کانٹے بھی، درندے بھی، جھاڑ جھنکار، غار، تاریکیاں بھی ہیں۔ دھوکول اور فریبوں کے جال بھی، لعن طعن، پتھر، گالیاں بھی ہیں، انعام و اکرام میں غافل ہو جانا بھی ہے اور تمام وہ منازلِ دشوار جن سے تمام انبیائے سابقہ کو گزرنا پڑا تھا۔ ارتقائے روحانی میں ہر نبی کا مقام ایک منزل، ایک نشانِ راہ ہے۔ ان کی خصوصیتوں کے خصوصی واقعات کے آخر کچھ تو کڑوے گھونٹ اس متلاشی حق کو بھی پینا ہیں کیونکہ اسے ایقان کی سطح پر گامزن ہو کر حق کی راہ میں بادیہ پیمائی کے لئے نکل کھڑا ہونا ہے اور بحرِ حق کو پار کرنے کی آرزو رکھنا ہے۔ یہ اگر شریعت کی راہ اختیار کرتا تو اس سمندر سے گزرنے کے لئے کشتی تو مل جاتی۔ طریقت کی راہ اختیار کرتا تو بادبان بھی مل جاتے اور موافق ہوائوں کے سہارے اس سفر پر گامزن ہو جاتا۔ مگر اس متلاشیٔ حق نے تو حقیقت کی راہ اختیار کی ہے۔ عقل و فہم کی قیود کو توڑ کر اس بحرِ حقیقت میں لنگر انداز ہو گیا ہے۔

شریعت کشتیٔ دارو، طریقت بادبانِ اُو

حقیقت لنگر آں داروزِ راہِ فکر دشوار است

بس اسی شدتِ قلندرانہ میں اس کے عشق کی صداقت کے طفیل وہ دستِ کرم اسے نصیب ہے جو یہ سفر پورا کراتا ہے۔ یہ سفر عرفان کی حد تک ہوتا تو طریقت کے جہاز میں سفر کرا کر علم عطا کرا دیا جاتا، دیکھ لیتا، جان لیتا، اطمینان ہو جاتا۔ سیر انفس بھی ہوتی اور سیر آفاق بھی۔ مگر خود ہو کر جاننا اور بات ہے۔ اب قدم قدم پر دستِ کرم کی ضرورت ہے پھر بھی تو سب کچھ اپنے ہی زورِ باطن پر منحصر ہے۔ مچھلی کی طرح طالب بحرِ حقیقت بنے ہیں تو اپنی ریڑھ کی ہڈی کے بل بُوتہ ہی پر یہ سفر طے ہو سکتا ہے۔ مگر جس نے کشتی توڑ دی، دبان پھاڑ کر پھینک دیئے، سارے سہارے چھوڑ دیئے وہ ریڑھ کی ہڈی کا بھی کیا سہارا لے۔ **بسم اللہ مجریھا و موسٰھا اِنّ رَبّی لغفور الرحیم**۔ جذبۂ عشق میں محبوب یہ یکتائیت اپنے باطن وجود میں ہے۔ اپنے ہی اندر غوطہ لگا کر منزلِ آدم تک پہنچے۔

حضرت آدمؑ ظہورِ اول، بناماں باپ ظہور میں آئے۔ آپ کے وجود کا منبع اور مخرج وہی ذاتِ باری ہے۔ وہ حواؑ کا ساتھ وہ شجر ممنوعہ، وہ جنت سے اخراج، جدائی وہ تنہائی، وہ گریہ، وہ پہلی توبہ، یہ توبہ کی لذت زندگی میں ایک بار ہی ملتی ہے۔ توبہ کیا ہے شدت سے پھر رحمت کی طرح رجوع ہونا ہے۔ وجود اور نفس کے مقام سے رجوع الی اللہ ہے۔ نفس امارہ سے رہائی ہے، یہ باطنِ وجود کی توبہ ہے۔ حقیقت آدم تک رسائی کی بات ہے۔ اس مقام پر روح کی توبہ ایک بار ہو گئی تو دروازہ کھل گیا۔ یہ پہلا آسمان ہے، مقامِ نفس ہے۔

اب قلب وروح کی ارتقائی منازل شروع ہوتی ہیں۔ ان ہی میں وہ طوفانِ نوح اپنے تنور کا اُبل پڑنا ہے۔ عشق کا ظہور ہے، عاشق کا باطن پھٹ جاناہے۔ بیج پھٹ کر کلّہ نکلنا۔ الا اللہ کی نمود، لوّامہ سے نجات اسی لئے آدمِ ثانی کہلائے۔ اس کے بعد کی منازل سے گزرتے ہوئے حضرت یحییٰ کی طرح خویش واقارب سے قطع تعلق۔ حضرت ایوب کی طرح جذام میں مبتلا ہو کر صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ حضرت اسمٰعیل کی طرح چھری گلے پر پھرتی ہو تو بھی رضا اختیار کرنا۔ پھر خلعتِ ابراہیمی، تعینات کے بُتوں کو توڑنا۔ حقیقت ذات کی تلاش، جستجو، تڑپ۔ نسبتِ ابراہیمی عشق کی آگ کا گلزار ہونا ہے۔ یہ دوسرا آسمان ہے نفس مطمئنہ کا مقام ہے۔

مگر وہ تجلی کی تڑپ، حضرت موسیٰ کا مقام، دین دنیادونوں جوتیاں اتار کر حق کی طرف رجوع۔ ستر ہزار پردوں میں تجلی، پھر بھی بیہوش، وہ شوقِ کلام اس کلام کی نسبتِ روح سے جبرئیل نور کی صورت میں آئے۔ قلب پر انوار و تجلیات وارد ہوئے۔ معجزئہ ید بیضا، عصا عطا ہوئے کلیم اللہ ہوئے۔ یہ تیسرا آسمان ہے۔ مقامِ قلب ہے۔

اس کے بعد مقامِ عیسوی تک پہنچائے گئے۔ خود ہی کلمتہ الحق ہوئے۔ قلندرانہ زندگی عشق ہی عشق، تُو ہی تُو۔ روحِ انفرادی، روحِ اعظم میں جا ملی، مقامِ روح پر اٹھالئے گئے انا روحی پکار اٹھے۔ روح اللہ کہلائے۔ جبرئیل بھی قمری کی صورت میں آئے یہ چوتھا آسمان ہے یہاں سے روح کی مدارج شروع ہوئے۔

روحِ اعظم کے مقام پر عشق کو پھیلائو نصیب ہوا۔ سرِ خفی کے مدارج طے ہوئے۔ نسبتِ یوسفی عطا ہوئی۔ بشارتوں کی کھڑکی کی کھلی، چاہِ زندانِ حُسنِ باطن، ماہ کنعان بن کر چمک اٹھا۔ شہود غیب نصیب ہوا۔ یہ پانچواں آسمان ہے۔

اب باطن وجود کے غیب میں پھیلنا شروع ہوا۔ نسبت یونس سے مقامِ اخفا، بحرِ حقیقت کی منزلیں۔ مچھلی نے نگل لیا، ہادی کے قبضہ میں اپنا کُل وجود۔ اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ باطن وجود سے دوسری توبہ جاری ہوئی۔ طالب خود آیہ کریمہ بن گیا۔ روح کو قُربِ ذات کی شدت کی طلب ملی۔ مچھلی نے اُگل دیا۔ ہادی سے جُدا ہوئے۔ بحرِ حقیقت میں رحمتوں کے سایے میں تنہا سفر۔ یہ چھٹا آسمان ہے، یہاں تک رسائی جبرئیل کے ذریعہ نفس عیسیٰ دمِ عشق کے ذریعہ روح الامین کو پہنچا۔

فتح الغیب، ساتویں آسمان کا باطن کُھلا۔ ربوبیت حق کے سہارے ھُو تک رسائی ہوئی۔ مقام سدرۃ المنتہیٰ، جبرئیل بھی آگے جانے سے عاجز۔

پھر وہ عالمِ ذاتِ لامتناہی، یہاں سے حضور پُر نور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شروع ہوا اور اس کی انتہا۔

ہمہ پیغمبراں در جستجو ئند

خدا داند کہ تُو در چہ مقامی

یہ مقامِ محمود بالذات وصفات ہے۔ ذاتِ حقیقی کا بہ صفاتِ حقیقی ظہور ہے۔ معراج اور معراج سے واپسی۔ اظہارِ حقیقت کے لئے دنیا میں واپسی، عبدہٗ و رسولہٗ کا مقام ہے۔ خلق سے بھی رابطہ ہے۔ اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل، جبرئیل بھی اب مکمل انسان کی صورت میں آئے۔ کعبہ تعین

ذات کی نشانی مقرر ہوئی ہر ماسوائے ذات سے نکل کر ذات کا دروازہ کُھلا۔ شکرانۂ بندگی، شکرانۂ وجود طاری ہوا۔ اس کے بعد وجود بھی حجاب استغفارِ وجود، یہ تیسری توبہ ہے۔ اِدھر سے عاجزی اُدھر سے درود و سلام۔ کائنات میں رَفعنالَکَ ذِکرک ہے۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

کیسے بھر لائوں مدھوا کی گگری

O

پنگھٹ صبر ایوبیؑ کا مقام ہے کہ مال و دولت۔ عزیز و اقارب، جسم، گوشت پوست سب نذر کر دینے کے بعد بھی حمد باری تعالیٰ جاری ہوتی ہے۔ ''اللہ کا تھا، اسی نے لے لیا، سب تعریف اُس قادرِ مطلق کے لئے ہے۔'' پنگھٹ کربلا کا مقام ہے، یہاں اپنے عزیزوں، رُفقا سمیت، دست و پا بُریدہ ہو کر بنائے لاالٰہ بنا جاتا ہے۔ یہاں یا اس کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے کے بعد بھی امام زین العابدین کی طرح نعتِ محبوب قلب و روح سے جاری ہوتی ہے۔ پنگھٹ وہ خون کا دریا ہے جس کی بابت حضرت لعل شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

چو آبش جملہ خوں دیدم تبر سیدم ازیں دریا

پنگھٹ وہ مقام ہے جس کی بابت حضور پیرانِ پیرؒ نے فرمایا۔

شکر للّٰہ کہ نہ مُردیم و رسیدیم بہ دوست

یہ وہ صبر ہے جس کے شُکر کی لذت لی جاتی ہے۔ کیسا شکوہ، کیسی شکایت یہاں تو اپنے کو ہی اس آزمائش کا حقدار سمجھا تا ہے۔ یہ سب کاروانِ فقر اسی پنگھٹ کی جانب رواں دواں ہے جہاں ساقیٔ کوثر کے ہاتھوں تشنہ لبی کی سیر ابی ہونی ہے۔ جو اس راہ میں سائے اور پانی کی تلاش میں رُک گیا وہ رہ گیا اور جس نے خون کا دریا پار کیا وہ پنگھٹ تک پہنچا۔

یہ ثُم وجہ اللہ یہ فقرِ ہُو اللہ

ہوئی سُرخ رُو بندگی اللہ اللہ

☆...☆...☆